

بحث و نظر

## شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اہم فقہی نظریات

(۲)

مولانا اختر امام عادل

### اختلافات فقہاء کی بحث:

سرور اکرم ﷺ کے بعد صحابہ میں سیاسی اختلافات کے علاوہ شدید علمی اور نظریاتی اختلافات بھی رونما ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ امت کی تاریخ کے ہر دور میں رہا۔ تابعین اور ائمہ مجتہدین میں اختلافات ہوئے۔ صحابہ اور علماء کا اختلاف ایک نازک اور حساس مسئلہ ہے۔ اگر بہت زیادہ احتیاط نہ کی جائے تو اکثر لوگوں کے قدم پھسلنے کا سخت اندیشہ ہے۔ کتنے افراد اور جماعتیں صرف اسی مسئلہ کی بنیاد پر افراط و تفریط کا شکار ہوئیں اور گمراہ قرار پائیں۔ ایک احساس یہ بھی ابھرتا ہے کہ صحابہ اور علماء جیسی مقدس جماعت میں آ کر اختلاف کیوں ہوا؟ اختلاف تو بظاہر اچھی چیز نہیں ہے۔ پھر ایسی مثالی جماعت میں یہ چیز کیوں کر پیدا ہوئی؟ اس کے اسباب اور وجوہ کیا تھے؟

حضرت شاہ صاحب کے حساس اور محتاط قلم نے اس موضوع کا بھی حق ادا کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ اور ”الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف“ میں شاہ صاحب نے صحابہ و تابعین اور فقہاء و مجتہدین کے اختلافات کی حقیقت اور اس کے اسباب و وجوہ پر بہت ہی سیر حاصل اور بصیرت افروز بحث کی ہے۔ پوری تفصیل کے لئے اصل کتاب کی طرف ہی مراجعت مناسب ہوگی۔ البتہ بعض اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض صحابہ اور تابعین کا باہمی اختلاف دین کے اصول اور اساسیات میں نہیں تھا، بلکہ فروعی اور جزوی مسائل میں تھا۔ جس سے منشاء الہی یہ ہے کہ امت کے لئے کئی راہیں کھول دی جائیں اور اس کے لئے توسع پیدا کیا جائے۔ اسی لئے ایک حدیث میں صحابہ کے اختلاف

کو انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے المقاصد الحسنیہ میں یہی ہی کی المدخل کے حوالے سے نقل کیا ہے:

ان أصحابی بمنزلة النجوم فی السماء قائما أخذتم بہ اہتدیتم و اختلاف  
أصحابی لکم رحمة۔ (۱)

یقیناً صحابہ آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں، پس ان میں جس کو بھی پکڑ لو گے، ہدایت پا جاؤ گے اور میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔

خليفة راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے:

ما سرنی لو أن اصحاب محمد ﷺ لم یختلفوا لأنہم لو لم یختلفوا لم  
تکن رحمة۔ (۲)

مجھے اس سے خوشی نہ ہوتی کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا، کیوں کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا تو ہمارے لئے آسانی نہ ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آج ہمارے لئے مسائل اور احکام کتابوں میں مدون اور مرتب موجود ہیں اور تمام احکام کے مدارج مقرر ہیں، کہ یہ فرض ہے، یہ واجب ہے، یہ جائز ہے، یہ حرام ہے، یہ ناجائز ہے، یہ مکروہ ہے، اس طرح کی کوئی مدون فقہ عہد صحابہ میں موجود نہیں تھی اور نہ صحابہ ان تفصیلات و جزئیات کے درپے رہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا۔  
صلوا کما رأیتمونی اصلی۔ (۳)

مجھے جس طرح نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو۔

اب ان کے لئے کہاں گنجائش تھی کہ ایک ایک بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کریں کہ نماز میں فرائض کتنے ہیں اور واجبات اور محجبات کتنے؟ یا وضو میں کون سا عمل سنت ہے یا کون سا فرض؟ وہ صرف انتظار کی کیفیت میں رہتے تھے کہ حضور کوئی عمل کریں تو اس کو دیکھیں، یا کوئی اعرابی حضور ﷺ کے پاس آ کر سوالات کرے تو ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ صحابہ کرام حضور ﷺ سے سوالات کے باب میں کافی محتاط تھے، اسی لئے حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ:

”میں نے اصحاب رسول سے بہتر کوئی جماعت نہیں دیکھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کل تیرہ (۱۳) سوالات کئے اور وہ سارے کے سارے قرآن میں محفوظ

کر دیئے گئے: **يَسْتَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ - يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ**  
 وغیرہ صحابہ صرف مفید اور ضروری باتیں ہی دریافت کرتے تھے، غیر ضروری سوالات  
 سے گریز کرتے تھے۔“ (۴)

حضرت قاسم فرماتے تھے کہ ”تم لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات اور تحقیق و  
 تفتیش کرتے ہو جن کے بارے میں ہم نہیں کرتے تھے۔ تم لوگ ایسے سوالات کرتے ہو جو ہمارے  
 علم میں نہیں ہوتے، اگر وہ ہمیں معلوم ہوں تو ہمارے لئے ان کا چھپانا جائز نہ ہو۔“

اور جب معاملہ صرف دیکھنے اور از خود جاننے پر موقوف تھا، مزید سوال کرنے اور کریدنے  
 کا رجحان ہی نہیں تھا تو جس صحابی نے جس چیز کو دیکھا، محفوظ رکھا اور اپنے اجتہاد اور فکر سے اس کی  
 کوئی شرعی حیثیت مقرر کر لی۔ ہر صحابی اپنے مشاہدے اور علم کا پابند تھا۔ ہر ایک کو ستارہ ہدایت قرار دیا  
 گیا تھا۔ عہد نبوت میں کسی فقہی مسئلہ پر باہم مذاکرہ اور مباحثہ کی نوبت بھی کم آتی تھی۔ رسول اکرم  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ عہد نبوی کے بعد صحابہ اقطار عالم  
 میں پھیل گئے، پھر ان سے مسائل اور حوادث دریافت کئے گئے۔ صحابہ نے حضور ﷺ سے جو دیکھا اور  
 سنا وہ محدود تھا اور حوادث و واقعات لامحدود تھے۔ پھر ہر صحابی کو حضور ﷺ کی ہر چیز دیکھنے یا سننے کا  
 موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایک نے ایک چیز دیکھی اور سنی تو دوسرے کو اس کا علم نہیں تھا، پھر دیکھنے اور سننے  
 والوں میں بھی اس چیز کی شرعی حیثیت کی تعیین میں اختلاف ہوا، کیونکہ حضور ﷺ نے مدارج اور  
 حیثیتوں کی صراحتاً تعیین نہیں فرمائی تھی۔ اس کا فیصلہ خود اپنی صوابدید سے قرآن اور حالات کی روشنی  
 میں طے کرنا تھا۔ یہی وہ بنیادی اسباب تھے جن کی بنا پر صحابہ میں فروغی اختلافات ہوئے۔ جن کی بنا  
 مکمل اخلاص، رضا الہی کی طلب اور فکر و اجتہاد پر تھی۔ اگر ہم ان اسباب اور ان سے پیدا شدہ  
 اختلافات کا تجزیہ کریں تو کئی صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، مثلاً:

■ بارہا ایسا ہوا کہ کسی صحابی نے اپنے اجتہاد سے کوئی مسئلہ بتایا، جب کہ اس سلسلے میں دوسرے  
 صحابی کے پاس حدیث موجود تھی، جس کا مذکورہ صحابی کو علم نہیں تھا اور ان کا اجتہاد حدیث کے  
 خلاف تھا۔ پھر جب ان کو حدیث کا علم ہوا تو فوراً انہوں نے اپنے اجتہاد سے رجوع فرمایا۔  
 مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ کوئی شخص صبح تک جنابت کی حالت میں رہے  
 تو اس دن کا روزہ نہیں ہوگا۔ بعض ازواج مطہرات نے ان کو اس موقف کے خلاف حدیث

ایک عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابوداؤد و ترمذی)

رسول بتائی تو انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ (۵)

■ اگر صحابی کا اجتہاد حدیث رسول کے مطابق ہوتا تو ان کو کافی مسرت ہوتی۔ مثلاً نسائی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ ان سے ایک ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کا مہر مقرر نہیں تھا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: مجھے اس مسئلہ میں حضور ﷺ کا کوئی فیصلہ معلوم نہیں، لیکن متعلقین واقعہ کا اصرار ہوا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی رہنمائی فرمائیں۔ قریب ایک ماہ تک وہ لوگ حضرت ابن مسعود سے دریافت کرتے رہے اور وہ خاموش رہے۔ بالآخر حضرت مسعود نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ فرمایا کہ ایسی عورت کو مہر مثل ملے گا، نہ کم نہ زیادہ، اس پر عدت واجب ہوگی اور وہ وراثت کی حق دار ہوگی۔ اتفاق سے جس محفل میں حضرت ابن مسعود نے یہ فیصلہ کیا اس میں صحابی رسول حضرت محفل بن یسار رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اسی قسم کے ایک واقعہ میں حضور ﷺ نے بالکل یہی فیصلہ فرمایا تھا۔“ یہ سن کر حضرت ابن مسعود اتنے خوش ہوئے کہ نعمت اسلام سے سرفراز ہونے کے بعد اتنی خوشی ان کو کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ (۶)

■ کبھی ایسا ہوا کہ صحابی کو حدیث ایسے طور پر یا ایسے ذریعہ سے پہنچی جس سے ان کو شرح صدر نہیں ہوا اور اس کی بنیاد پر وہ اپنے اجتہاد کو ترک نہ کر سکے۔ مثلاً حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں۔ حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک سفر کا واقعہ یاد دلایا کہ ہم دونوں ساتھ تھے اور ان کو جنابت پیش آ گئی تھی اور پانی نہیں مل سکا تھا تو انہوں نے غسل پر قیاس کر کے پورے بدن میں مٹی کی مالش کر لی اور نماز ادا کر لی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ”انتا کرنے کی ضرورت نہ تھی، صرف اس قدر کافی تھا“ اور آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح فرمایا، مگر حضرت عمر کو اس روایت پر اطمینان نہیں ہوا اور وہ اپنے اجتہاد پر قائم رہے۔ (۷)

■ کئی سہو اور نسیان بھی اختلاف کا سبب بنا ہے، مثلاً حضرت ابن عمر فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو اس کو ابن عمر کی

بھول قرار دیا۔

کبھی اختلاف اس بنیاد پر ہوا کہ ایک صحابی نے ایک حدیث ایک طرح سے محفوظ کی، اور دوسرے صحابی نے دوسری طرح سے، مثلاً حضرت ابن عمر یا حضرت عمر حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے تھے: ان السیت بعد بکاء اہلہ علیہ (سیت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ روایت سنی تو فرمایا کہ انہوں نے واقعہ کو صحیح طرح سے محفوظ نہیں رکھا۔ واقعہ دراصل یہ تھا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک یہودیہ کی قبر کے پاس سے گزرے جس کے مرنے پر اس کے گھر والے رو رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ”یہ لوگ اس کے لئے رو رہے ہیں، حالانکہ اس کو قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔“ راوی نے یہ سمجھا کہ یہ عذاب اس کو گھر والوں کے رونے کی بنا پر دیا جا رہا ہے اور پھر اس کو ہر سیت کے لئے عام قاعدہ کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ (۸)

کبھی اختلاف علت حکم کی تعیین کے سلسلے میں ہوا، مثلاً جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا حکم کس وجہ سے ہے؟ ایک رائے یہ تھی کہ یہ حکم بلائکہ کی تعظیم کی بنا پر ہے۔ اس علت کے مطابق جنازہ خواہ مومن کا ہو یا کافر کا، ہر ایک کے لئے یہ حکم عام ہے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ یہ حکم موت کی ہولناکی کے پس منظر میں دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ حکم عام ہوگا۔ ایک تیسری رائے حضرت حسن بن علی کی ہے، کہ دراصل حضور ﷺ ایک جگہ تشریف فرما تھے کہ وہاں سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ اس لئے کھڑے ہو گئے کہ کافر کی لاش آپ کے سر مبارک کے اوپر سے نہ گزر جائے۔ اس علت کے مطابق یہ حکم صرف کافر کے جنازہ کے لئے ہے۔ (۹)

اختلاف کی ایک وجہ دو مختلف روایات میں جمع و تطبیق بھی رہی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال متعہ کی اجازت دی۔ اوطاس کے موقع پر بھی اس کی اجازت تھی۔ اس کے بعد اس کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ان دو مختلف حکموں کی توجیہ کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حکم ممانعت بدستور باقی ہے۔ رخصت محض ضرورت کی بنا پر دی گئی تھی۔ پھر جب ضرورت ختم ہو گئی تو ممانعت کر دی گئی۔ جب کہ جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ رخصت اباحت تھی اور حکم نبی آنے کے بعد یہ اباحت منسوخ ہو گئی۔ (۱۰)

غرض یہ وہ بنیادی اسباب تھے جن کی بنا پر صحابہ میں علمی، فکری اور اجتہادی اختلافات

ہوئے، مگر یہ اختلافات کسی نفسانیت یا اصرار پر مبنی نہیں تھے، بلکہ اجتہاد و اخلاص اور رضاء الہی کی طلب پر مبنی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی صحابی کو ان کی رائے کے خلاف صحیح طور پر کوئی حدیث یا دلیل معلوم ہوئی، انہوں نے اسی وقت اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ رضی اللہ عنہم و رضو عنہ۔

### اختلاف صحابہ کے دور رس اثرات:

پھر صحابہ کا یہی اختلاف بعد کے ادوار میں منتقل ہوا اور مختلف حلقوں نے اپنے ذوق اور سہولت کے لحاظ سے مختلف صحابہ کا اثر قبول کیا، نقطہ نظر کا اختلاف ہوا، شخصیات اور حالات کے لحاظ سے رجحانات میں فرق آیا، اور مختلف اجتہادی کوششوں کے نتیجے میں مختلف مکاتب فقہ و جہود میں آگے۔ مدینہ میں حضرت سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ کا مسلک فقہی رائج ہوا۔ ان کے بعد زہری، قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمن کا دور رہا۔ مکہ میں عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کيسان اور شام میں مکحول کو درجہ امامت حاصل ہوا۔

اس طرح بعد کے فقہاء کے لئے اختلاف کا راستہ کھل گیا اور قرن اول کے بعد کثرت سے مجتہدین پیدا ہوئے اور فروغی مسائل کو انہوں نے اسلام کے بنیادی اصول اور اساسی مزاج کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی، جس پر ہر علاقے کے اپنے حالات و ظروف اور پیش رو شخصیات کی چھاپ تھی۔ چونکہ اس عمل کی بنیاد روایت پر ہے اس لئے اس کے لئے شجرہ نسب کی صحت اور اتصال بے حد ضروری ہے اور اسی وجہ سے ہر بعد والے نے اپنے سے قبل والے سے علم حاصل کیا، جس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ جس کو جس استاذ سے علم سیکھنے کا موقع ملا اس نے بالعموم اس کے معیار کو قبول کیا اور اس نے بھی اسی نقطہ نظر سے واقعات کا مطالعہ کیا جس سے اس کے مشائخ نے کیا تھا اور اجتہاد اور استنباط میں اس نے بھی وہی منہج اختیار کیا جو اس کے اساتذہ کا تھا۔ اس طرح ہر علاقے کے علماء اور فقہاء پر وہاں کے پیش رو اکابر و مشائخ کے اجتہادات کی چھاپ پڑی اور یہی فقہاء کے اختلاف کا بنیادی سبب بنا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ”الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف“ میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس پہلو کو مرکزی اہمیت دی ہے اور اس پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ایک عالم پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابوداؤد و ترمذی)

مثلاً حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے مکتب فقہی پر حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت اور تابعین میں حضرت عروہ، حضرت سالم، حضرت عکرمہ، حضرت عطاء، حضرت عبید اللہ بن عبید اللہ اور دیگر فقہاء مدینہ کے اقوال و افکار کی چھاپ پڑی۔ مشہور ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے اجماع کو حجت قرار دیتے تھے، اس لئے کہ مدینہ ہر دور میں علماء اور فقہاء کا مرکز رہا ہے۔ وہ کئی متفقہ مسئلہ کے بارے میں کہتے تھے:

”السنة النسي لا اختلاف فيها عندنا كذا وكذا“ یعنی جس سنت میں ہمارے یہاں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ اور یہ ہے۔ کوئی مسئلہ خود علماء مدینہ کے درمیان اختلافی ہوتا تو وہ اپنے ذوق اجتہاد یا کثرت قائلین، یا قیاس قوی یا کتاب و سنت کی کسی تخریج سے موافقت کی بنیاد پر انہی میں سے کسی قول کا انتخاب کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر امام مالک فرماتے تھے: ”هكذا أحسن ما سمعت“ (یہ میرے سنے ہوئے اقوال میں سب سے بہتر قول ہے)۔ دوسری طرف حضرت امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے فقہاء کوفہ میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت شریح، حضرت شعبی اور حضرت ابراہیم نخعی کے اقوال و اجتہادات کا اثر قبول کیا۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت عالمیہ نے شریک کے مسئلہ میں حضرت مسروق کا میلان حضرت زید بن ثابت کی طرف دیکھا تو کہا: ”هل أحد من أثبت من عبد الله“ (کیا کوئی حضرت عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر بھی قابل اعتماد ہے؟)

شاہ ولی اللہ تو اس باب میں بہت آگے تک چلے گئے ہیں جس سے مکمل اتفاق ضروری نہیں، وہ کہتے ہیں:

و ان شئت أن تعلم حقيقة ما قلناه فلخص أقوال إبراهيم من كتاب الآثار  
لمحمد رحمه الله تعالى وجامع عبدالرزاق، ومصنف ابى بكر بن ابى  
شيبه ثم قايسه بمذهبه تجده لا يفارق تلك المحجة الا فى مواضع  
يسيره وفى تلك اليسيره أيضاً لا يخرج عما ذهب اليه فقهاء  
الكوفة۔ (۱۱)

اگر تم میری بات کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو کتاب الآثار، جامع عبدالرزاق، اور مصنف ابی بکر ابن ابی شیبہ سے حضرت ابراہیم نخعی کے اقوال کی تھلیص کرو، پھر امام ابو حنیفہ کے مذہب سے ان کا موازنہ کرو، تم چند مقامات کے سوا کچھ فرق محسوس نہ کرو

گے اور ان چند میں بھی وہ فقہاء کوفہ کے اقوال سے تجاوز نہیں کرتے۔

یہی حال دیگر فقہاء کا بھی ہے۔ مدینہ کے محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب، مکہ کے ابن جریج اور ابن عیینہ، کوفہ کے ثوری اور بصرہ کے ربیع بن صبیح کے جو مختلف اقوال کتب فقہ و حدیث میں ملتے ہیں اور ان سے انکے جن فقہی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے اس میں بھی ان کی جھلک موجود ہے۔

### فقہ شافعی پر مختلف مکاتب فقہ کا اثر:

امام شافعی رحمہ اللہ نے مالکی اور حنفی دونوں مکاتب فقہ سے استفادہ کیا۔ اس لئے ان کے یہاں کافی تنوع ملتا ہے۔ مدنی روایات کا رنگ بھی ہے اور کوئی فکر و نظر کا بھی۔ ایک طرف ان کے یہاں اجتہاد و استنباط کی گہرائی اور گیرائی محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف اختلاف کے وقت وہ اصح مافی الباب کو اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ فقہ حنفی سے اس قدر متاثر ہیں کہ ساری دنیا کو فقہ میں امام ابوحنیفہ کا عیال کہتے ہیں اور امام محمد کی توصیف و تحسین سے ان کی زبان نہیں ٹھکتی اور دوسری طرف مختلف اساتذہ سے استفادہ اور درپیش مقامی حالات کی بنا پر فقہ حنفی سے سب سے زیادہ اختلاف کرنے والے بھی وہی ہیں۔ امام مالک کی صحبت میں رہے۔ اس کا رنگ ایک تھا۔ امام محمد کی ہم نشینی میں آئے تو اس کا رنگ کچھ اور ہوا اور مصر گئے تو ایک اور کیفیت پیدا ہوئی۔

### فقہ حنبلی پر فقہ شافعی کا اثر:

رہے امام احمد تو انہوں نے زیادہ تر استفادہ امام شافعی سے کیا اور انہی کا رنگ ان پر جاری رہا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تو فقہ حنبلی کو کسی مستقل مکتب فقہی کے بجائے فقہ شافعی کی ایک شاخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، لیکن چون کہ ان کے مذہب کی تدوین امام شافعی کے مذہب کے ساتھ عمل میں نہیں آئی، اس لئے دونوں جداگانہ مذاہب قرار دیئے گئے۔ (۱۲)

اسی لئے ان کی رائے یہ بھی ہے کہ مذہب شافعی کا مفتی (خواہ وہ مجتہد فی المذہب ہو یا تجر فی المذہب) اگر کسی مسئلہ میں اپنے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی طرف مراجعت کی ضرورت محسوس کرے تو اس پر اولاً لازم ہے کہ وہ امام احمد کے مذہب کی طرف مراجعت کرے، اس لئے کہ امام احمد امام شافعی کے اجل تلامذہ میں تھے۔ علم اور دیانت دونوں لحاظ سے وہ امام شافعی کے جانشین تھے اور ان کا مذہب درحقیقت مذہب شافعی کی شاخ اور ایک قسم ہے۔ (۱۳)

☆ فرض وہ فعل ہے جسے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو اور جسے جان بوجھ کر ترک کرنا سخت گناہ ہے ☆



## اختلاف فقہاء کا دوسرا سبب:

صحابہ کرام میں علمی اختلاف کے جو اسباب تھے وہ بعد کے فقہی اختلافات کے بھی باعث بنے۔ مثلاً اس دور میں تمام حدیثیں یکجا نہیں تھیں، اس لئے ممکن ہے کہ کسی فقیہ تک کوئی حدیث نہ پہنچی ہو اور اس نے اپنے اجتہاد سے کام لیا ہو اور وہ اجتہاد حدیث کے مطابق ثابت نہ ہو۔ مثلاً امام زہری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ہندہ کو مستحاضہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت کا علم نہیں تھا۔ وہ بہت روتی تھیں، اس لئے کہ وہ خود مستحاضہ تھیں اور نماز نہیں پڑھتی تھیں۔ (۱۴)

## تعلیل و توجیہ میں اختلاف:

یاد روایت تو پہنچی مگر اس کی تعلیل و توجیہ میں اختلاف ہوا، اور فقہ میں زیادہ تر اختلافات اسی بنیاد پر ہوئے ہیں۔ اسکی مثالیں عہد صحابہ اور عہد فقہاء میں بی شمار ہیں۔ مثلاً قلتین کی روایت ہے:

اذا كان الماء قَلْتَيْنِ لم يحمل الخبث۔ (۱۵)

کہ پانی دو قَلتے (مٹکے) ہو جائے تو نجاست نہیں اٹھاتا۔

اس حدیث کے مطابق امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ دو قَلتے پانی ماء کثیر ہے۔ حنفیہ دو قَلتے پانی کو ماء کثیر نہیں مانتے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ امام ابو حنیفہ کو شاید قلتین کی حدیث نہیں پہنچی، اسی لئے انہوں نے اپنے اجتہاد سے قلتین کو ماء کثیر ماننے سے انکار کیا۔ خود شاہ ولی اللہ کا بھی یہی خیال ہے۔ (۱۶)

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے سامنے بھی یہ روایت تھی، مگر اس روایت کے معنوی اور جہنی اضطراب کی بنا پر انہوں نے اس کو حجت نہیں تسلیم کیا، نیز اس روایت کی توجیہ ان کے نزدیک وہ نہیں جو امام شافعی نے کی ہے، بلکہ ان کی توجیہ یہ تھی (جو خود روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے) کہ اس حدیث میں پانی سے مراد ارض جواز کا مخصوص پانی ہے جو کہ مکہ اور مدینہ کے راستہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ پہاڑی چشموں کا پانی تھا جو اپنے معدن سے نکل کر نالیوں سے بہہ بہہ کر چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جمع ہو جاتا تھا اور اس کی مقدار عملاً قلتین سے زائد نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ پانی جاری ہوتا تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ نجس نہیں ہے۔ اس کی تائید روایت کے ابتدائی الفاظ سے ہوتی ہے: ”وهو يسئل من الماء، يكون في الفلاة من

الاما ابیح للضرورة بقدر بقدرها ۶۶ جو چیز ضرورتاً مباح کی گئی ہو اس کی مقدار کا تعین اسی کے مطابق ہوگا

الأرض وما ينبوہ من السباع والدواب“ یعنی سوال ایسے پانی کے بارے میں تھا جو صحرائی زمینوں میں پایا جاتا تھا، جس پر درندے اور جانور آتے رہتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں گھڑے یا مٹکے میں پائے جانے والے پانی کے بارے میں سوال نہیں ہو رہا ہے، بلکہ صحراؤں کے پانی کے بارے میں سوال ہو رہا ہے اور تحدید نہیں، بلکہ بیان واقعہ تھا۔ یہ تشریح خود امام ابوحنیفہ نے اپنے شاگرد امام ابو یوسف سے کی تھی: اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث اذا كان جارياً (اگر پانی دو قلتے ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اگر وہ بہتا ہو) (ہو)۔ (۱۷)

### رد و قبول کے معیار میں اختلاف:

روایات کے رد و قبول کے معیار میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا۔ بعض فقہاء نے علوسند کو اہمیت دی تو بعض نے راویوں کے علم و فقہ کو۔ اس کا اندازہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی اس گفتگو سے ہوتا ہے جو مبسوط اور متعدد کتب فقہ و سیر میں مذکور ہے (اور شاہ صاحب نے متعدد جگہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے) کہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی ملاقات مسجد حرام میں ہوئی تو امام اوزاعی نے کہا: کیا بات ہے اہل عراق رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے، جبکہ مجھ سے زہری نے سالم عن ابن عمر کی سند سے یہ حدیث بیان کی کہ حضور ﷺ ان دونوں مواقع پر رفع یدین فرماتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: مجھ سے حماد نے ابراہیم نخعی عن علقمہ عن عبد اللہ بن مسعود کی سند سے یہ حدیث روایت کی کہ نبی کریم ﷺ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے، اس کے بعد پھر رفع یدین کرنا چھوڑ دیا۔ اس پر امام اوزاعی نے برہم ہو کر کہا: تعجب ہے ابوحنیفہ آپ پر! میں زہری عن سالم کی سند سے روایت کر رہا ہوں اور آپ مجھ سے حماد عن ابراہیم کی سند سے حدیث بیان کرتے ہیں۔ ان کا اشارہ علوسند کی طرف تھا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے اور ابراہیم سالم سے بڑے فقیہ تھے اور اگر ابن عمر کو صحبت حاصل نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ ان سے بڑے فقیہ تھے اور عبد اللہ تو عبد اللہ ہی ہیں، یعنی انہوں نے راویوں کی فقہت اور وقت نظر کو مدتیج بتایا۔ اس پر امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔ (۱۸)

## روایات کے جمع و تطبیق میں اختلاف:

کبھی روایات کے جمع و تطبیق میں اختلاف ہوا۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت استنجاء میں استقبال قبلہ میں منع فرمایا۔ اور حضرت جابر نے وفات نبوی سے ایک سال پیش تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف رخ کر کے استنجاء کرتے ہوئے دیکھا اور حضرت ابن عمر نے حالت استنجاء میں حضور ﷺ کی پشت قبلہ کی طرف اور رخ شام کی طرف دیکھا۔ اب ان روایتوں کی جمع و تطبیق میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا۔ امام شععی اور کئی فقہاء نے کہا کہ ممانعت صحرا کے ساتھ خاص ہے، اس لئے آبادی یا بند مقام میں استقبال یا استدبار میں حرج نہیں، جب کہ امام ابو حنیفہ اور متعدد فقہاء کے نزدیک یہ حکم امتناع عام محکم ہے اور حضور ﷺ کے عمل میں خصوصیت کا احتمال ہے۔ (۱۹)

غرض مختلف اسباب تھے جن کی بنا پر فقہاء کے درمیان اختلافات ہوئے اور مقصد صرف ایک تھا، یعنی رضائے الہی کی جستجو اور حقیقت حکم تک رسائی۔ معاذ اللہ ہوئی یا ہوس یا طلب جاہ یا طلب مال مقصود نہیں تھا، بلکہ پیش نظر اللہ کی مرضی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی سے راضی تھے۔ اس لئے توثیق و تعریف کے انداز میں آپ نے اس کی پیشین گوئی فرمائی۔

شیخ الاسلام امام ابو الفضل عبدالرحمن بن ابوبکر سیوطی نے اپنی کتاب ”جزیل المواہب فی اختلاف المذہب“ میں بیہتی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی حکم کتاب اللہ میں ہو تو اس پر عمل ضروری ہے، کوئی اس کو چھوڑنے پر معذور نہیں سمجھا جائے گا اور اگر کوئی حکم قرآن کریم میں نہ ہو تو پھر میری سنت ثابتہ پر عمل کرے، اگر میری سنت میں بھی نہ ہو تو اس پر عمل کرے جو میرے صحابہ فرمائیں، کیونکہ کہ میرے صحابی آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں، جس کے قول کو اختیار کرو گے ہدایت پر رہو گے اور میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔ (۲۰)

## اختلاف فقہاء کی شرعی حیثیت:

البتہ یہاں ایک اہم ترین بحث یہ ہے کہ اگر فقہاء کا یہ اختلاف مرضی الہی کے مطابق ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت میں کسی دور میں اس نظری اور قرونی اختلاف کو مٹانے کی کوئی

کوشش نہیں کی گئی تو اس اختلاف کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ اختلاف، اختلافِ حق و باطل ہے؟ یا اختلافِ صواب و خطا؟ یا یہ کہ ہر پہلو حق و ہدایت پر مبنی ہے؟

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ”المہاج“ میں، قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ”شفاء“ میں، علامہ۔ محمد بن یوسف رحمہ اللہ صالحی و مشقی نے ”تذکرۃ النعمان“ میں اور دیگر کئی علماء نے اس سے تعرض کیا ہے اور بہت ہی اہم علمی بحیثی کی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے بھی اپنے مخصوص فکر و مزاج کے مطابق اپنے خاص اسلوب میں ”عقد الجدید فی احکام الاجتہاد و التقلید“ میں اس پر اچھی روشنی ڈالی ہے اور انتہائی مدلل اور فکر انگیز پیرایہ بیان میں ایک نقطہ اعتدال پیش کیا ہے:

اس پر تمام ہی علمائے حق کا اتفاق ہے کہ فروعی مسائل میں مجتہدین کا اختلاف، اختلافِ حق و باطل نہیں ہے۔ یعنی اس کا کوئی پہلو باطل نہیں ہے۔ اس لئے کہ احادیث میں اجتہادی خطا پر بھی اجر کا وعدہ کیا گیا ہے اور کوئی مہطل مستحق اجر نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں بنیادی طور پر دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں:

- ۱۔ یہ اختلافِ صواب و خطا ہے۔ یعنی اختلاف کی صورت میں ایک مجتہد صواب پر ہے اور دوسرا خطا پر۔
- ۲۔ یہ اختلافِ عزیمت و رحمت ہے، یا اختلافِ افضل و غیر افضل ہے، یعنی ہر ایک حق پر ہے۔ صرف عزیمت و رخصت یا افضل و غیر افضل کا فرق ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی رائے جمہور فقہاء کی ہے، اور ائمہ اربعہ سے بھی یہی نقل کیا جاتا ہے۔

ابن السمعانی رحمہ اللہ نے القواطع میں لکھا ہے کہ یہی امام شافعی کا ظاہر مذہب ہے۔ المہاج میں قاضی بیضاوی نے بھی اس کو امام شافعی کا قول صحیح کہا ہے اور اپنا میلان بھی اسی کی طرف ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں:

والمختار ما صح عن الشافعی ان فی الحادثة حکماً معیناً علیہ امارۃ من وجدھا أصاب ومن فقدھا أخطأ ولم یأثم۔ (۲۱)

لائیق اختیار بات یہ ہے کہ جو امام شافعی سے صحیح ثابت ہے کہ ہر واقعہ میں کوئی ایک معین حکم ہوتا ہے جس کے لئے علامت موجود ہوتی ہے، جس نے اس علامت کو پایا

وہ صواب تک پہنچ گیا اور چونکہ پہنچ سکا وہ خطا پر ہے۔ مگر گنہگار نہ ہوگا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے امام شافعی کے اس قول کی تفسیر قاضی بیضاوی سے مختلف کی ہے، فرماتے ہیں:

”اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر واقعہ میں کوئی ایک مقرر حکم ہے جو صواب ہے اور اس کے علاوہ خطا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ میں ایک قول اصول اور طرق اجتہاد کے زیادہ موافق ہوتا ہے جس پر دلائل اجتہاد سے کوئی ظاہری علامت موجود ہوتی ہے۔ جس نے ان اصول، طرق اجتہاد اور دلائل اجتہاد کی رعایت کی اس نے صحیح کیا، ورنہ غلطی کی، مگر گنہگار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ امام شافعی نے ”کتاب الام“ کے اوائل میں تصریح کی ہے کہ عالم اگر عالم سے کہے کہ تم نے غلط کیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ تم نے علماء کے شایان شان راستہ اختیار نہیں کیا اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور بہت سی مثالوں سے اس کو واضح کیا ہے، یا ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسئلہ میں خبر واحد موجود ہے تو جس نے حدیث پر عمل کیا وہ صواب پر ہے اور جس نے (لاعلیٰ میں) اس کے خلاف اجتہاد کیا وہ خطا پر ہے۔ کتاب الام میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے۔“ (۲۲)

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا خود شاہ صاحب کو بھی اس انتساب پر اطمینان نہیں ہے۔ اسی لئے وہ لکھتے ہیں:

والحق أن مانسب الی الائمة الأربعة قول منخرج من بعض تصریحاتهم  
ولیس نصاً منهم۔ (۲۳)

حق بات یہ ہے کہ ائمہ اربع کی طرف اس کا انتساب ان کی بعض تصریحات سے ماخوذ ہے، صراحتاً ان سے ثابت نہیں۔

دوسری طرف امام کردری صاحب متحول کے رد میں امام شافعی کی طرف اس کے برعکس دوسری رائے منسوب ہے۔ انہوں نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے:

ان المجتہدین القائلین بحکمین متساویین بمنزلة رسولین جاء  
بشریعتین مختلفین وکلتاہما حق وصدق۔ (۲۴)

دو مجتہدین جو دو مساوی حکم کے قائل ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے دو رسول دو مختلف شریعتیں لے کر آئے اور دونوں ہی برحق ہیں۔

☆ یقین لایزول بالشک ☆ یقین شک کی وجہ سے زائل نہیں ہوتا ☆ (فقہی ضابطہ)

دوسری رائے کے قائل امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، ابو زید دہلوی، قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابوالحسن اشعری، قاضی میر، قاضی ابومحمد الدارکی، ابن شریح اور امام شعبی ہیں۔ اور جمہور متکلمین، اشاعرہ و معتزلہ سے بھی یہی منقول ہے۔ علامہ مازری کی رائے بھی یہی ہے اور اسی کو انہوں نے اکثر فقہاء، متکلمین اور ائمہ اربعہ کا مسلک بتایا ہے۔ اس رائے کے مطابق مجتہدین کے دونوں جانب حق ہے۔ کیونکہ اگر دونوں حق پر نہ ہوتے تو اجر نہ ملتا۔ یہ حقیقی خطا نہیں، بلکہ افضلیت کی خطا ہے۔ حقیقی خطا جب ہے کہ قرآن و حدیث اور اثر و اجتماع کے ہوتے ہوئے اجتہاد کرے اور اجتہاد ان کے خلاف ہو، یہ مقبول نہیں۔ (۲۵)

”شفاء“ میں قاضی عیاض کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

”مجتہدین کی حقانیت ہی ہمارے نزدیک صحیح اور درست ہے اور شیخ سیوطی نے اس کی شرح میں فرمایا **ع** کہ ”ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ائمہ (ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، اور ابن جریر) اور دوسرے ائمہ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔“ (۲۶)

قطب ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ اپنی مشہور زمانہ کتاب ”میزان کبریٰ“ میں لکھتے ہیں:

ان جميع الأئمة المجتهدین دائرون مع أدلة الشريعة حيث دارت، وأنهم كلهم متزهون عن القبول بالرأى فى دين الله وما بقى لك عذر فى التقليد لأى مذهب شئت من مذاهيم فانها كلها طريق الى الجنة..... وأنهم كلهم على هدى من ربهم وأنه ما طعن أحد فى قول من أقوالهم إلا بجعله به۔ (۲۷)

تمام ائمہ مجتہدین دلائل شرعیہ کی بنیاد پر کوئی بات کہتے ہیں۔ وہ اللہ کے دین میں محض اپنی رائے سے کوئی بات کہنے سے پاک ہیں۔ اس لئے ان مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کی (جس کو تم پسند کرو) تقلید میں اب تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ یہ تمام مذاہب جنت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں اور یہ سب کے سب اپنے رب کی طرف سے حق و ہدایت پر ہیں اور جس نے بھی ان بزرگوں کے کسی قول پر طعن و تشنیع کیا ہے اس نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ بھی بنیادی طور پر اسی کے قائل نظر آتے ہیں:

فلا بد ان یکونا حکمین لله تعالیٰ أحدهما أفضل من الآخر كالعزيمة  
والرخصة۔ (۲۸)

ضروری ہے کہ دونوں حکم اللہ ہی کے ہوں، ان میں سے ایک دوسرے سے افضل ہو،  
جیسے کہ عزیمت اور رخصت۔

### شاہ صاحب کا تجزیہ:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس مسئلے کا بڑا بصیرت افروز تجزیہ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”یہاں وہ اجتہاد زیر بحث نہیں ہے جو صریح نص کے خلاف ہو۔ وہ تو بالیقین باطل ہے،  
اسی طرح وہ اختلاف بھی موضوع بحث نہیں ہے جس میں کسی ایک جانب قطعیت یا غلبہ ظن کے ساتھ  
حق کا یقین ہوتا ہو، اور وہ اختلاف بھی داخل گفتگو نہیں ہے جس کے دونوں جانب عمل کرنے کی قطعی یا  
ظنی طور پر گنجائش ہو، جیسا کہ قرأت سبع یا الفاظ دعا میں اختیار دیا گیا ہے۔ یہاں صرف وہ اختلافات  
زیر بحث ہیں جو فروعی مسائل میں ہوں اور کسی کے پاس نص کی کوئی صراحت اس سے متعلق موجود نہ  
ہو۔ بنیادی طور پر اس کی چار صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ ایک مجتہد کے پاس حدیث موجود ہو اور دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ اس صورت میں متعین طور  
پر ایک صواب پر ہے اور دوسرا خطا پر، لیکن یہ خطا چونکہ اختیاری نہیں ہے اس لئے اس پر گناہ نہ  
ہوگا۔

۲۔ ہر ایک کے پاس کچھ احادیث اور آثار موجود ہوں جن کی تطبیق یا ترجیح میں ان کے درمیان  
اختلاف ہو اور ہر ایک کا اجتہاد اسے الگ سمت میں لے جاتا ہو۔

۳۔ احادیث و آثار متحد ہوں، لیکن ان کے الفاظ کی تشریح، اصطلاحی تعریف، ارکان و شرائط کی  
تحدید، مناسبات کی تخریج، تحقیق و تنقیح اور جزئیات پر کلیات کی تطبیق وغیرہ میں اختلاف ہو۔

۴۔ اصولی مسائل میں اختلاف کی بنا پر فروعی مسائل میں اختلاف ہو۔

مؤخر الذکر تینوں صورتوں میں چونکہ ہر مجتہد کا مآخذ تقریباً ایک ہے، اس لئے ہر ایک کو  
مصیب قرار دیا جائے گا۔ پس زیادہ سے زیادہ افضل یا غیر افضل یا عزیمت یا رخصت کا فرق ہوگا، کہ

ہر ایک نے اپنی ذمہ داری پوری کی اور اپنی قوت اجتہاد اور نظر و فکر کو استعمال کر کے صحیح حکم تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اور انسان اس سے زیادہ کا مکلف نہیں ہے۔

متعدد روایات و واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں حضرات صحابہ کرام میں اختلاف رائے ہوا۔ حضرت ابوبکر کی رائے فدیہ لینے کی تھی اور نبی کریم ﷺ نے اسی کو ترجیح دی، جب کہ حضرت عمر کی رائے قتل کرنے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری رائے کو ترجیح دی اور پہلی رائے کے بارے میں فرمایا:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (الانفال: ۶۸)

اگر اللہ کی تقدیر میں یہ تمہارا عمل نہ ہوتا تو فدیہ لینے پر عذاب الہی نازل ہوتا۔

علامہ دمشقی فرماتے ہیں: ”معلوم ہوا کہ حکمت خداوندی فدیہ لینا ہی تھی، اس لئے فدیہ کو حلال اور طیب فرمایا کہ تم نے غنیمت میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس کو کھاؤ، یہ حلال و طیب ہے، البتہ قتل افضل تھا اور فدیہ جائز، صحیح دونوں تھے۔ اسی طرح مذاہب میں جو ترجیح ہوتی ہے وہ اکثر افضل و غیر افضل ہی کی ہوتی ہے۔“ (۲۹)

ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فطرکم یوم تفترون و أضحاکم یوم تضحون۔ (۳۰)

تمہارا افطار اسی دن ہے جس دن تم افطار کرو اور تمہاری قربانی اسی دن ہے جس دن تم قربانی کرو۔

شاہ صاحب نے اس ذیل میں خطاب کی تشریح نقل فرمائی ہے:

ان الخطأ موضوع عن الناس فیما کان سبیلہ، الاجتہاد فلو ان قوما اجتهدوا فلم یروا الهلال الا بعد ثلاثین فلم یفطروا حتی استوفوا العدد ثم ثبت عندهم ان الشهر کان تسعاً و عشرين فان صومهم و فطرهم ماضٍ و لاشیء علیہم من و زراؤ عتب و كذلك فی الحج اذا اخطاوا یوم عرفه فانہ لیس علیہم اعادته و یجزئہم أضحاہم ذلک و انما هذا تخفیف من اللہ سبحانه و رفق بعبادہ۔ (۳۱)

اجتہادی امور میں لوگوں کی خطا معفو عنہ ہے۔ اگر ایک قوم نے چاند دیکھنے کی کوشش کی

☆ الاصل بقاء ماکان عل ماکان۔ بیادہی طور پر جو چیز جس حالت پر ہو اسی پر بانی رہتی ہے ☆



اور چاند ان کو تیس تاریخ سے قبل نظر نہیں آیا اور انہوں نے افطار تیس کا عدد مکمل کرنے کے بعد کیا، پھر بعد میں یہ ثابت ہوا کہ مہینہ آنتیس دن کا ہی تھا تو ان کا روزہ اور عید درست ہو گئے اور ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں ہوگا۔ یہی حکم حج کا بھی ہے۔ اگر عرفہ کے دن لوگوں سے غلطی ہو جائے تو ان پر اس کا اعادہ واجب نہیں اور ان کی قربانی درست ہوگی۔ یہ اللہ کی جانب سے بندوں کے لئے تخفیف اور سہولت ہے۔

اس طرح کی گنجائش کی بہت سی مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروعی اختلافات شریعت محمدیہ میں نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہیں، بلکہ ان میں بڑی وسعت رکھی گئی ہے، اور اس کے کلمی جانب کی تغلیظ و تنکیر سے ہر ممکن احتراز کیا گیا ہے۔

### فروعی اختلافات، دین میں توسع کی علامت:

اس امت کو جس خصوصی امتیاز سے نوازا گیا ہے وہ ہے قیاس و اجتہاد کی اجازت۔ قرآن و حدیث میں بالعموم مسائل و احکام سے صرف اصولی طور پر تعرض کیا گیا ہے۔ جزئیات و فروع سے بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ ان کی تطبیق و تشریح امت کے اجتہاد و استنباط پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جب کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن سے عہد نبوی میں بھی لوگ دوچار ہوتے تھے، مگر ان کے جواب میں بھی عموماً اصولی اور کلی انداز بیان اختیار کیا گیا اور جزئیات کو امت کے اجتہاد کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ دراصل جزئیات کی تعیین سے مسئلہ محدود ہو جاتا ہے اور لوگوں کے لئے صرف ایک راہ عمل متعین ہو جاتی ہے۔ جب کہ اللہ نے اس دین کا عمومی مزاج توسع کا رکھا ہے۔ تنگی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ دو باتوں میں سے ایسی بات کا انتخاب فرما گئے تھے جس میں عام لوگوں کے لئے سہولت کا پہلو غالب ہوتا اور اپنے نمائندوں کو بھی ہمیشہ اس کی تلقین فرماتے کہ ”تم کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تم لوگوں کی مشکلات آسان کرو، نہ کہ اس لئے کہ ان کے لئے تنگیاں پیدا کرو۔“

صحابہ کرام پیغمبر اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضور ﷺ سے خواہ مخواہ کے فروعی سوالات نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حضور اپنی طبیعت سے جتنی باتیں ارشاد فرماتے انہیں پر وہ قناعت کر لیتے تھے۔ انہیں علم کہ طلب ضرورتھی، وہ پیاس بھی رکھتے تھے، اسی لئے ان کی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی دیہاتی مجلس نبوی میں حاضر ہو اور سوالات کرے تو نئی معلومات حاصل ہوں،

لیکن خود سوالات کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ اس معاملے میں کافی محتاط تھے اور سوائے ضروری باتوں کے وہ سوالات سے گریز کرتے تھے۔ قرآن نے ان کا ایک عمومی مزاج بنا دیا تھا:

لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ قُبِلَ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ۔ (المائدہ: ۱۰۱)

تم ان چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر کھول کر بیان کر دی جائیں تو تم کو بری معلوم ہوں۔

قرآن نے بنی اسرائیل کی وہ منفی تصویر بھی سامنے رکھی تھی جس میں وہ ایک واقعہ قتل کی تحقیق کے لئے بقرہ (گائے) سے متعلق بہت سی ناخوش گوار جزئیات حضرت موسیٰ سے دریافت کرنے لگے تو وہ سخت مشکل میں پڑ گئے۔

غرض اجتہاد اس امت کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ فروعی اختلاف ہے اور روایات و واقعات بتاتے ہیں کہ اجتہادی اختلاف پر کسی صورت سے کوئی ٹکیر نہیں کی گئی، بلکہ اس کے ذریعہ جو توحیح پیدا ہوتا ہے اسے پسند کیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتہادی مسائل میں حق دونوں جانب مانا گیا ہے اور کسی کی تغلیط پسندیدہ نہیں ہے۔

### علم الہی کے لحاظ سے اجتہادی اختلاف کا تجزیہ:

اگر اجتہادات کا تجزیہ اس بنیاد پر کیا جائے کہ فی الواقع شارع کی کیا مراد ہے؟ کیا یہی علت جو بیان ہوئی ہے شارع کی نگاہ میں بھی مدار حکم ہے؟ یا علم الہی میں اس کے سوا کوئی دوسرا معنی و علت مقصود ہے؟ اس لحاظ سے غیر متعین طور پر کسی ایک کو ہی مصیب مانا جاسکتا ہے اس لئے کہ علم الہی میں کسی حکم کی کوئی ایک ہی بنیاد ہو سکتی ہے۔ فوائد و مصالح میں تعدد ممکن ہے، مگر علتوں میں نہیں، لیکن اگر اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو صراحتاً یا دلائل پابند کیا ہے کہ اگر نصوص یا ان کے مفاہیم میں اختلاف ہو جائے تو وہ اجتہاد اور حقیقت حق تک رسائی کی ممکنہ کوشش کے لئے مامور ہیں۔ اس وقت اگر مجتہدین میں اختلاف ہوتا ہے تو چونکہ ہر ایک نے حضور ﷺ کا عہد پورا کیا ہے اور حضور ﷺ کے مقرر کردہ خطوط پر اپنے فرائض کی تکمیل کی ہے اس لئے ہر ایک صواب پر ہے اور اور اس کے اجتہاد نے جو راستہ اس کو دکھایا ہے اس کی اتباع اس پر واجب ہے۔ جیسا کہ اندھیری رات میں اشتہاد قبلہ کے وقت تخری میں اختلاف کی صورت میں ہر ایک کے لئے اپنی تخری پر

ماجاز لعذر بطل بزوالہ ☆ جس کا استعمال مذکر کی وجہ سے جائز ہو عذر ختم ہوتے ہی جواز بھی ختم ہو جائے گا۔

عمل کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ ہر حکم اسی وقت واجب ہوتا ہے جب وہ چیز پائی جائے جس پر وہ موقوف ہے۔ اشتباہ قبلہ کے وقت ادائے صلوات کا حکم تحریری پر موقوف ہے، اس لئے تحریری کے مطابق نماز کی ادائیگی واجب ہے۔ نابالغ بچے کی تکلیف بلوغ پر معلق ہے، اس لئے بلوغ کے وقت اس کی تکلیف واجب ہوگی۔ اسی طرح اختلاف نصوص، اختلاف معانی یا نص کی عدم موجودگی کی صورت میں حکم اجتہاد و استنباط پر معلق ہے، اس لئے اجتہاد کے مطابق حکم واجب ہوگا۔ (۳۲)

فقہی مسائل میں شاہ صاحب کا حکیمانہ تفکر:

حضرت شاہ صاحب حکیم الاسلام تھے۔ ان کی حکیمانہ بصیرت اور اعتدال فکر کا اندازہ بالعموم اختلافی مواقع پر ہوتا ہے، یا جب کسی خاص مناسبت سے تاریخی تجزیے کی نوبت آتی ہے۔ مثال کے طور پر ازالۃ الخفاء کی تیسری جلد میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کے فقہ اور اجتہاد پر شاہ صاحب نے بڑے اہم حقائق کی طرف اشارے کئے ہیں، مثلاً:

■ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فقہ کو دیگر صحابہ کی فقہ سے وہی نسبت ہے جو آپ کے مصحف کو دیگر صحابہ کے مصاحف سے ہے۔ دیگر صحابہ کے مذاہب کی عمومیت کے ساتھ اتنی اشاعت نہیں ہوئی جتنی مذہب فاروقی کی اشاعت ہوئی۔ (۳۳)

■ مجتہدین امت کے لئے آپ کی حیثیت وہی ہے جو مجتہدین معین کے لئے مجتہد مستقل کی ہوتی ہے۔ آپ کو شرع میں واسطہ بنائے بغیر مجتہدین اولیٰ شرعیہ میں غور نہیں کر سکے ہیں۔ اہم مسائل فقہ میں مجتہدین فاروق اعظم کے مذہب کے تابع ہیں۔ (۳۴)

■ احادیث کی ترجیح و تطبیق میں مجتہدین نے حضرت عمر کا اتباع کیا۔ (۳۵)

■ حضرت عمر کے مسائل فقہ پر اجماع پایا جاتا ہے۔ ان کی زندگی میں لوگوں کو ان کے مسائل سے اختلاف کی جرأت نہ ہوئی۔ بعد میں اختلاف ظہم اور روایات کی بنا پر جزئیات میں اختلاف ہوا۔ قریب ایک ہزار مسائل میں مجتہدین فاروق اعظم کے تابع ہیں۔

”ازالۃ الخفاء“ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فقہ پر مستقل رسالہ ”فقہ عمر“ کے نام سے موجود ہے، جو غالباً کسی صحابی کی فقہ پر پہلی موسوعہ ہے۔ بالخصوص حضرت فاروق اعظم کی فقہ پر کام کرنے کی زیادہ ضرورت تھی، یہ علماء امت کے ذمہ قرض تھا۔ اس قرض کو غالباً پہلی بار حضرت شاہ صاحب نے چکایا۔

فقہ فاروقی کے بارے میں دو اہم نکتے:

اس رسالہ کے آخر میں شاہ صاحب نے دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ اہل علم کے لئے لائق توجہ ہیں:

نکتہ اولیٰ: شیخین کے زمانہ میں طریق اجتہاد و افتاء زمانہ ماقبل و مابعد کے مقابلہ میں اس کی خصوصیات۔ اس عنوان کے تحت شاہ صاحب رقم طراز ہیں:

”حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک افتاء و قضاء میں خلیفہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت عمر فاروق نے حضرت ابن مسعود سے فرمایا تھا: ”وَلِي حَاذَا مِنْ تَوَلَّى قَاذَا“ (یعنی تکلیف وہ کام انہی کے لئے چھوڑ دو جو اس سے راحت پانے والے ہیں) لیکن حضرت علی کے عہد خلافت میں انتشار ہوا۔ علماء و فقہاء کو انتظار رہا کہ خلافت منظم ہو جائے، لیکن جب ”خلافت خاصہ“ کے ایام بالکل ختم ہو گئے تو خلافت عامہ نے ظہور کیا اور اجتماع کی صورت بنی اور علماء ہر شہر میں علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ حضرت ابن عباس مکہ میں، حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ مدینہ میں فتویٰ و تفسیر کا کام کرتے تھے تو ابو ہریرہ اور ابوسعید خدری اور حضرت جابر بھی روایت میں مشغول ہوئے۔ حضرت انس اور حضرت عمران بن حصین بصرہ میں، حضرت براء بن عازب (حدیث میں) اور حضرت ابن مسعود (فقہ میں) کوفہ میں، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت ابو درداء اور حضرت ابوامامہ بابل و غیرہ شام میں۔ اس طرح فتاویٰ میں اختلاف ہوا اور ”اصحابی کالنجوم“ کے مقتضی کے مطابق لوگ عمل کرنے لگے۔

نکتہ ثانیہ: حضرت عمر روایت کے بیان کے باب میں کافی نقاط اور سخت تھے۔ آپ قلیل الروایہ مشہور ہیں، مگر اس سے مراد شاکل اور سنن ہدئی کی روایات ہیں، جس سے اس دور میں لوگ بکثرت واقف تھے اور ان کی خاص ضرورت نہ تھی، شرائع کی روایات اس سے مراد نہیں۔ بعض علماء مثلاً ابو محمد الدارمی وغیرہ نے اس کا مصداق مغازی کی روایات کو قرار دیا ہے۔ مگر شاہ صاحب کے نزدیک یہ راجح نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس سے مراد شاکل و عادات کی روایات ہیں، یا کوئی ایسی روایت بیان کرنا جسکے حفظ اور فہم میں خود راوی کو بھی اطمینان نہ ہو۔ (۳۶)

تطبيقات ثلاثہ کے مسئلے پر شاہ صاحب کا محاکمہ:

حضرت شاہ صاحب نے اسی کتاب میں بعض اختلافی مواقع پر جو علمی محاکمے فرمائے ہیں

☆ اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام ☆ جب حلال و حرام جمع ہو جائیں تو حرام غالب ہوگا ☆

وہ بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اور اس سے شاہ صاحب کی علمی و اجتہادی شان، قوت فکر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً:

۱۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کے زمانے اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دو سالوں میں ”تظلیقات ثلاثہ“ کو ایک طلاق مانا جاتا تھا، لیکن پھر حضرت ابن الخطاب نے یہ فیصلہ فرمایا کہ لوگ طلاق کے معاملے میں عجلت سے کام لے رہے ہیں، جبکہ اس معاملے میں بہت ہی زیادہ سنجیدگی، آہستگی اور احتیاط مطلوب تھی، اس لئے آئندہ جو کوئی بھی تین طلاق ایک ساتھ دے گا اس کو ہم نافذ قرار دیں گے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس پر ایک سوال اٹھایا ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کی وفات اور سلسلہ وحی کے انقطاع کے بعد کسی حکم کے منسوخ ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا، پھر حضرت فاروقؓ نے ایک ایسے حکم کو جو عہد نبوی میں جاری تھا اور عہد صدیقی میں بھی جاری رہا، کیسے منسوخ فرما دیا؟ علامہ بنوئی علماء کے تین جواب نقل فرماتے ہیں:

۱۔ ایک جواب یہ ہے کہ أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق کوئی شخص یہ تین جملے ایک ہی ساتھ دہرائے اور ہر جملے سے الگ الگ طلاق مراد ہو تو تین طلاق واقع ہوگی، لیکن اگر بعد کے دونوں جملوں سے پہلے ہی جملے کی فی الواقع تاکید و اعادہ مقصود ہو تو اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ مسئلہ شرعی یہی ہے۔ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں دیانت و امانت اور صدق و خیر کا غلبہ تھا اس لئے کوئی شخص یہ کہتا کہ میں نے تاکید اور اعادہ کے مقصد سے أنت طالق کے جملے کی تکرار کی ہے تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی نیت کے مطابق ایک ہی طلاق کا فیصلہ کیا جاتا تھا، لیکن جب حضرت فاروق اعظم نے محسوس کیا کہ اب عام لوگوں میں دیانت اور صداقت کا جذبہ کمزور پڑتا جا رہا ہے اور ہوئی و ہوس کا غلبہ ہو رہا ہے تو محض نیت پر اعتماد کی بات قضاء ختم فرمادی اور یہ فیصلہ فرمایا کہ قضاء فیصلہ ظاہر حال کے مطابق ہی دیا جائے گا اور تین کو تین مانا جائے گا، محض نیت اور ارادہ کی بنیاد پر اس کو ایک نہیں قرار دیا جائے گا۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر مرد اپنی غیر مدخول بہا بیوی کو ایک ہی جملے میں کہے ”أنت طالق ثلاثاً“ تو حضرت ابن عباس کے اصحاب و تلامذہ کی رائے یہ تھی کہ اس سے ایک ہی طلاق پڑے گی، جب کہ حضرت عمر اور جمہور اہل علم کی رائے یہ تھی کہ ایک جملے میں تین بولنے سے

تین طلاق واقع ہوگی۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ”تطلیقات ثلاثہ“ سے مراد ”أنت بنتہ“ کے لفظ سے طلاق دینا ہے۔ حضرت عمر کی رائے پہلے یہ تھی کہ اس سے ایک طلاق واقع ہوگی، مگر جب بعد میں اس لفظ کا بے جا استعمال ہونے لگا تو تین کا فیصلہ فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب نے علامہ بغوی کے یہ تینوں جوابات نقل کرنے کے بعد اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ میرے نزدیک سب سے بہتر بات یہ ہے کہ آیت کریمہ ”الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ“ میں دو احتمالات ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ ”أنت طالق ثلاثاً“ کو بظاہر کلمہ واحدہ ہونے کی بناء پر ”مرة واحدة“ سمجھا جائے گا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ معنی پر نظر رکھتے ہوئے اس کو یہ سمجھا جائے کہ اس نے أنت طالق کا لفظ تین بار دہرایا ہے اور محض اختصار کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے أنت طالق ثلاثاً کہہ دیا ہے۔ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں آیت کریمہ کا مفہوم اس تجزیہ کے ساتھ عام لوگوں پر واضح نہیں ہو سکا، اس لئے عام طور پر احتمال اول کی بنیاد پر لوگ أنت طالق ثلاثاً کو مرة واحدة قرار دے کر ایک ہی طلاق سمجھتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم نے اس مسئلے کو پوری طرح واضح کیا اور جب آپ کے سامنے اس قسم کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے دوسرے احتمال کی بنا پر اس کو تین طلاق قرار دیا۔ (۳۷)

شاہ صاحب کی تصنیفات اس قسم کے دقیق علمی و فقہی مباحث سے لبریز ہیں۔ اب تک جو کچھ پیش کیا گیا وہ اس کی محض ایک معمولی سی جھلک تھی۔

## حوشی و مراجع

- ۱۔ المقاصد الحسنة، ص ۱۲۔
- ۲۔ حوالہ بالا، ص ۱۲۔
- ۳۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین۔
- ۴۔ حجة الله البالغة، ص ۱۴۱۔
- ۵۔ حوالہ بالا ص ۱۴۲۔
- ۶۔ حوالہ بالا، ص ۱۴۳۔
- ۷۔ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، ص ۸۔

☆ لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان ☆ زمانہ کی تبدیلی کے سبب احکام کی تبدیلی کا انکار نہیں کیا جائے

- ۱۲۔ حوالہ بالا، ص ۳۳۔
- ۱۳۔ عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید، ص ۴۲
- ۱۴۔ الانصاف، ص ۴۔
- ۱۵۔ الانصاف، ص ۹۔ ۱۰۔
- ۱۶۔ الانصاف، ص ۹۔ ۱۰۔
- ۱۷۔ درس ترمذی، مولانا مفتی تقی عثمانی، ذکر یابک ڈپو، دیوبند، ۱۹۹۸ء، ۱/۲۷۷۔
- ۱۸۔ اعلاء السنن، ادارۃ القرآن کراچی پاکستان، ۵۹/۳۔
- ۱۹۔ الانصاف، ص ۵۔
- ۲۰۔ تذکرۃ العثمان، علامہ محمد بن یوسف دمشقی، شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، ص ۳۹۔
- ۲۱۔ ۲۳ عقد الجید، ص ۳۲۔ ۲۶ تذکرۃ العثمان، ص ۵۳۔
- ۲۲۔ میزان کبریٰ عالم الکتب بیروت، ۱۴۰۹ھ، ۱/۵۵۔
- ۲۳۔ عقد الجید، ص ۳۲۔
- ۲۴۔ تذکرۃ العثمان، ص ۵۲۔
- ۲۵۔ ۳۱ عقد الجید، ص ۳۳۔
- ۲۶۔ حوالہ بالا، ص ۳۶۔
- ۲۷۔ حوالہ بالا، ص ۳۰۴۔
- ۲۸۔ ازالۃ الخفاء، ۳/۲۹۹۔
- ۲۹۔ حوالہ بالا، ص ۳۰۵۔
- ۳۰۔ حوالہ بالا، ص ۳۰۵۔
- ۳۱۔ رسالہ فقہ عمر فاروق، ازالۃ الخفاء، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۱۷-۴۱۹۔

## Muslim Hands

The Organisation to fight against poverty !

*To Provide :*

Education, Vocational Training, Housing, Medical-Care, Food Distribution, Safewater; Electricity, to needy and poor Muslims.

**& To Look after the Orphans**

**148-164 Gregory Boulevard**

**Nottingham NG7 1BR U.K.**

**E.mail: [contact@muslimhandsorg](mailto:contact@muslimhandsorg)**